کمندیں پھینکنے لگتا ہے، کوئی اُن سے نہیں پوچھ سکتا کہ تمھیں قلم پکڑنا بھی آتا ہے یا تم نے پرائمری کلاسوں تک بھی تختی و سلیٹ کا کوئی شغل کیا ہے حقیقتاً یہ لوگ اپنی شکم پروری اور کسب معاش کے لیے زندگی کی راہوں میں محنت و جفاکشی سے فرار اختیار کرکے مذہبی مناصب، پیری مریدی اور مزارات و مدارس کی پناہ ڈھونڈ کر عیش کی بانسری بجاتے اور بزبان حال پکارتے ہیں ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

پھر نادان اور سیدھے سادھے عوام کے لیے یہ معمہ آخر تک معمہ ہی رہتا ہے

الٰہی..... یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں
کہ سلطانی بھی عیاری ہے، درویشی بھی عیاری

.....

بہرحال ہم ہندوستان کے مسلمان اس حقیقت کو اپنے لیے سرمایہ صد فخر و سعادت سمجھتے ہیں کہ گزشتہ صدی میں ہمارے درمیان دو ایسی عظیم اور مثالی ہستیاں ہوئی ہیں جنھوں نے پوری صلاحیت اور وصف کمال کے ساتھ خدمت افتاء انجام دی اور اس منصب رفیع کا اعلیٰ معیار قائم کیا، اور اس حد تک اور اس شان کے ساتھ اس دینی ذمہ داری کو نباہا کہ پورے عالم اسلام نے ان کے تفقہ فی الدین، اُن کی علمی گہرائی، فکر و بصیرت اور اُن کی عالمانہ عظمتوں کو سر آنکھوں پر رکھا اور برملا تسلیم کیا۔

ان دو بزرگوں میں پہلی شخصیت دارالعلوم دیوبند کے مفتی اول حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانی رحؒ کی تھی اور دوسری عظیم شخصیت حضرت العلامہ مفتی محمد کفایت اللہ رحؒ کی۔ حق یہ ہے کہ ان اسلاف کے اٹھ جانے کے بعد

ملت اسلامیہ میں دُور دُور تک اس درجہ کمال کو کوئی دوسری شخصیت نہیں پہنچ سکی۔ یہ ضرور ہے کہ پچھلی صدی کے مقابلہ میں آج علم اور علمی مراکز کی ارزانی اور فراوانی کہیں زیادہ ہے۔ اور کاروباری اور اشتہاری علماء کی، مفتیوں کی، مرشدوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ لیکن حقیقی استعداد و صلاحیت اور جوہری قابلیت کا دور شاید ان اسلاف کے ساتھ ختم ہی ہوگیا۔ فیاللاسف!

.....

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی کے خلف اکبر بھی تھے اور شاگرد رشید بھی۔ خوش قسمتی سے اُن کو دار العلوم دیوبند کا خیر القرون، دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور علامہ انور شاہ کشمیریؒ (جن کو خاتم المحدثین کہا گیا ہے) جیسے ارباب علم و فضل کا سایۂ شفقت اور دعائیں میسر آئی تھیں۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور دار العلوم کے سابق مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ تو مفتی صاحبؒ کے حقیقی چچا ہی تھے، رفقاء درس بھی ایسے میسر آئے تھے کہ ؏

اب انھیں ڈھونڈ چراغ رُخِ زیبا لے کر

یعنی مولانا محمد یوسف بنوری، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا سید محمد بدر عالم مہاجر مدنی مؤلف ترجمان السنہ، مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی مولانا قاری محمد طیبؒ وغیرہ وغیرہ۔

اِس گرد و پیش اور سراپا خیر و برکت ماحول میں مفتی صاحب نے علوم درسیہ کی تکمیل کی اور ساتھ ہی اپنے والد بزرگوار کے سایۂ سعادت میں فتویٰ نویسی کی مشق جاری رکھی، اس طرح جب اُن کی علمی استعداد درجۂ

وثوق و اعتماد کو پہنچ گئی تو دارالعلوم ہی میں اُن کو صفِ اول کا مدرس اور ساتھ ہی مفتی دارالعلوم کا منصب تفویض کر دیا گیا۔ پھر کئی سال یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد جب اکابر دارالعلوم کا کاروان علم و فضل ڈابھیل (گجرات) منتقل ہوا تو اپنے استاذ محترم علامہ کشمیری اور عم محترم مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ساتھ مفتی صاحب بھی ڈابھیل چلے گئے اور وہاں کی نوبہار دینی درسگاہ میں درس و تدریس کے ساتھ ساتھ افتاء کی خدمت انجام دینے لگے۔ ڈابھیل میں آپ نے کئی سال یہ خدمت انجام دی۔

تحریک آزادی کا ایک یادگار فتویٰ

اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۳۲ء) مفتی صاحبؒ کے قلم سے وہ تاریخی اور انقلابی فتویٰ صادر ہوا جس نے تحریک آزادیٔ وطن کو اسلامی فکر و بصیرت کے ایک نئے عزم و ولولہ سے روشناس کیا اور اس تحریک کے جاں نثاروں میں جوش عمل کی ایک نئی روح پھونک دی۔

ان دنوں گاندھی جی ڈانڈی مارچ کے سلسلہ میں گجرات کے دیہات و قصبات کا دورہ کر رہے تھے اور دوسری طرف نمک ستیہ گرہ میں گرفتار ہونے والوں، ٹیکس نہ دینے والوں اور انگریز حکمرانوں کے احکام سے ٹکرانے والوں پر بدیشی سامراج کے غیظ و غضب کی تان ٹوٹ رہی تھی۔ اُن کی املاک و آراضی قرق کر کے نیلام کی جا رہی تھیں۔ مفتی صاحب ان دنوں دھراشنہ پہنچ کر گاندھی جی سے ملے اور وہاں سے ڈابھیل واپس آتے ہوئے انھوں نے ایک مستفتی کے جواب میں برملا یہ فتویٰ دیا کہ بدیشی حکمرانوں کی طرف سے اس وقت آزادی پسندوں کی جائیدادیں، زمینیں اور املاک جس طرح ضبط کی جا رہی ہیں